عندها جنة المأوى اذ يغشى السدرة ما يغشى جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ سدرہ جنت ہی کے کسی مقام کا نام
اور یہ ایسی پُر انوار جگہ ہے کہ جہاں ہر لمحہ تجلیاتِ الٰہی کا ہجوم رہتا ہے۔ معراج میں آپ کن کن مقامات سے گزرے۔ قلب و بصر
کن کن حجابات قدرت و جنت سے دوچار ہوئے۔ اور آپ نے انبیاء سے کہاں کہاں ملاقاتیں فرمائیں۔ ان سب باتوں کی تفصیل
حدیث و سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے۔ اس سلسلہ میں سمجھنے کی در اصل تین چیزیں ہیں۔ معراج کا واقعہ کب ظہور پذیر ہوا کیا
یہ ممکن ہے کہ ایک انسان ایک ہی جست میں ان مقامات کو طے کر لے۔ اور کوئی طبعی رکاوٹ پا بہ زنجیر نہ ہو۔ اور یہ کہ
کیا اس سے بشر کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔

جہاں تک معراج کے تاریخی پس منظر کا تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے۔ تمام سیر نگار
اور مورخین اس پر متفق ہیں کہ یہ وہ وقت تھا۔ جب کہ اہل مکہ کی طرف سے آنحضرت کو بے حد اذیتیں پہنچائی جا رہی تھیں
جب آپ پر سرزمین وطن کی وسعتیں تنگ ہو رہی تھیں۔ جب اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے منصوبے
تیار کئے جا رہے تھے۔ اور جب ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے۔ کہ یا تو مٹھی بھر مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام سے
دست بردار ہو جائیں۔ اور یا پھر کم از کم مکہ میں نہ رہنے پائیں۔ اس سے آنحضرت کس درجہ کبیدہ خاطر تھے اس کا نقشہ سورہ بنی
اسرائیل سے کچھ ہی پہلے سورہ نحل کی آخری آیات میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ واصبر وما صبرك الا بالله ولا
تحزن عليهم ولا تك في ضيق مما يمكرون۔ کہ اے پیغمبر مخالفین کی ان ایذاؤں پر صبر کرو۔ اور صبر خدا کی توفیق
ہی سے ہو پاتا ہے۔ اور ان اعداء دین کے حال پر افسوس نہ کرو۔ اور نہ ان کی معاندانہ تدبیروں اور سازشوں سے گھبرا کر
تنگدلی کا مظاہرہ ہی کرو۔

گویا عین اسوقت جبکہ صنادید قریش آنحضرتؐ کو ستا رہے تھے۔ اور بزعم خود اسلام کو ملیا میٹ کر دینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے
اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کی تسکین قلب کے لئے معراج کی نعمتیں مہیا کیں۔ اور ان لوگوں کو بتایا کہ جس ذات گرامی کی مخالفت پر
تم کمربستہ ہو اس کا ہمارے ہاں کیا درجہ اور رتبہ ہے۔ اور تم جنہیں مکہ سے نکالنا چاہتے ہو ان کی تگ و تاز اور فتوحات کے
دائرے کیونکر زمین و آسمان کی پہنائیوں تک پھیلے ہوتے ہیں۔ معراج کے اس پس منظر کی روشنی میں اس حقیقت پر بھی غور
فرمائیے کہ سدرہ کے اس سفر کو سب سے پہلے جس مقام ارضی تک پہنچایا گیا۔ وہ مسجد اقصیٰ یا بیت المقدس کی سرزمین پر تھا
ہے۔ جس کے صاف صاف معنی یہ ہیں۔ کہ قرآن ان لوگوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہے۔ کہ تمہیں تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں
مکہ کی محدود سیادت اور سربراہی سے محروم نہ ہونا پڑے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے اسلام کے قدم انبیاء کے بعض
مولد و مسقط تک پہنچ کے رہیں۔

اس میں شک و شبہ نہیں کہ معراج کی راہ میں ایک رکاوٹ زمان و مکان کی مشکلات بھی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ بات ابھی ہماری سمجھ
میں آنے والی نہیں کہ رات کے چند لمحے جنہیں آنحضرت نے آسمانوں تک کا فاصلہ طے کیا ایسی وسعتوں کو گھیر لیں اور مرکوز کر لیں؟

کہ جن میں سیر و سلوک کی ان تمام تفصیلات کو ممکن قرار دیا جا سکے۔ وقت کی ایک متعین رفتار ہے اور وہ ایسی ہی منطقی ہے کہ جس میں پھیلاؤ کی گنجائش نہیں۔ اس طرح زمین کی کشش ثقل اور دوسرے طبعی قوانین ہیں۔ جو بالعموم اپنی کارفرمائیوں میں آزاد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے ان سب چیزوں پر کیونکر قابو پا لیا۔ جواب بیں سادہ ہے یعنی تخرج کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل سادہ ہے۔ ایک تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اور قضا و قدر کا ایسا ظہور نہیں ہو جا تا برجا اور عام ہو۔ یہ ایک اہم غیر معمولی اور معجزانہ ظہور ہے۔ دوسرے سوال ایک بشر کی پرواز یا ایک انسان کی اڑان کا نہیں۔ ایک عبد کا ہے۔ جسے اللہ نے اپنی قدرت خاص سے قرب و منزلت کے اس مقام پر مفتخر فرمایا ہے۔ اس لئے یہ نہ دیکھئے کہ آنحضرت طبعی حدود و قوانین کے حصار کو توڑ کر آگے بڑھ سکتے ہیں یا نہیں بلکہ یہ دیکھئے کہ پروردگار عالم جس نے یہ کارخانہ قائم کیا ہے۔ جس نے یہ قوانین اور قاعدے بنائے ہیں۔ اور جس کے ارادہ و قدرت کے طفیل یہ دنیا نے ہست و بود و معرض وجود میں آئی۔ وہ اگر چاہے تو کیا ان اونچے رکاوٹوں کو دور نہیں کر سکتا۔ اور وہ اگر پسند کرے تو کیا زمانہ کی وسعتیں سمٹ نہیں سکتیں اور جسد خاکی آسمان کی بلندیوں تک اڑ نہیں سکتا۔ جب ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرتوں کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ عقل و ادراک کی تمام صلاحیتیں بھی اس کے تصور پر قادر نہیں۔ اور یہ تسلیم کر لیا۔ کہ وہ ذات گرامی منتخب اور چیدہ حضرات سے گفتگو بھی کرتی ہے۔ حالانکہ انسانی علم و تجربہ میں نبوت و رسالت کی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے کوئی پیمانہ اور مثال نہیں تو معراج کے ان لینے میں جو نبوت ہی کا ایک مقام ہے۔ کیا دشواری حائل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس مسئلہ میں ابوبکر سے بڑھ کر حکیمانہ جواب اور کسی کو نہیں سوجھ سکتا۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ کیوں صاحب آپ اب اس معاملہ میں بھی آپ اپنے پیر و مرشد کی تصدیق فرما دیں گے۔ کہ ایک جست اور پرواز میں وہ آسمان تک ہو آئے ہیں۔ تو انہوں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ کیوں نہیں میں تو اس سے زیادہ دشوار تر حقیقت پر ایمان لا چکا ہوں۔ اور وہ ہے آپ کا منصب نبوت پر فائز ہونا۔ معراج کے متعلق اس مختصر وضاحت کے بعد اب ہمیں اس کے اس پہلو پر غور کرنا ہے کہ کیا اس سے انسان کے رتبہ و مقام میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ مسئلہ کے اس پہلو کی طرف عنوان میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اور اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا تنہا نائب و خلیفہ ہے۔ یہ کہ اس کا امن فکر و عمل کبھی سابقہ لغزش و معصیت سے آلودہ نہیں بلکہ یہ سراسر پاکیزہ و بلند فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ انسان کے بارہ میں اسلام کا یہی وہ روشن تصور ہے جو اس کو دوسروں سے ممیز ٹھہراتا ہے۔ اور کائنات میں اس کا ایک مقام متعین کرتا ہے معراج کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روحانی ترقیات کے حدود تا بہ لامکاں وسیع ہیں۔ اور یہ اگر بشر ہے تاہم اس کے مقامات سیر و سلوک کی حد بندی آسان نہیں۔ جب یہ اپنی خواہشات اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان کر دے اور اس کا عبد بندہ ہو جائے تو پھر نہ پوچھئے کہ یہ کن کن انعامات کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ اور کن کن رتبوں اور درجوں پر فائز کیا جاتا ہے۔ یہ ہے معراج کی اصلی روح اور اس کا حقیقی فلسفہ۔

بشیر احمد شاہ

تحریکِ سید اپنے تاریخی پس منظر میں

سرسید کی تحریک مسلمانوں کی زندگی میں ایک تہذیبی اور ذہنی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی لیکن اس کی افادیت کے متعلق اس وقت بھی اور آج بھی بعض غلط فہمیاں موجود ہیں۔ بعض اس کی سیاسی نوعیت پر اور اکثر اس کی مذہبی تجدید پر معترض ہیں۔ اس لئے اس تحریک کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس تاریخی پس منظر کا مطالعہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے یہ تحریک ابھری اور بہت جلد اس نے مسلمانوں کے ذہنوں پر اپنا پائیدار اثر چھوڑا۔

اس تاریخی پس منظر میں سب سے پہلی نمایاں چیز جو اس تحریک کو اپنے پیش رووں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کا نیا سیاسی رجحان ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز سے جب مسلمانوں کو اس چیز کا احساس ہوا کہ سیاسی طور پر وہ ہندوستان میں اقتدار کھو چکے ہیں تو انہوں نے اس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کوشش شروع کی۔ ان تمام کوششوں کی مرکزی طاقت امراء نہ تھے بلکہ مسلمان عوام تھے جن کو سیاسی اقتدار کے چلے جانے سے معاشی مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا تھا۔ اس انقلاب کی شدت کا احساس سب سے پہلے بنگال کے مسلمانوں کو ہوا جہاں انگریزوں کی سرپرستی میں ہندوؤں نے تجارتی کاروبار سے بہت زیادہ دولت کمائی اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس دور میں مسلمانوں کے باقی ماندہ امراء اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر کبھی انگریزوں کے ساتھ اور کبھی ان کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہے اور عوام کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ اس معاشی بدحالی کو دور کرنے کا ایک حل یہ تھا کہ سیاسی اقتدار دوبارہ حاصل کیا جاتا۔ سر سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کار کی تحریک جہاد کا جو ۱۸۷۰ء تک مختلف شکلوں میں جاری رہی یہی مقصد معلوم ہوتا ہے۔ اس تحریک کا ایک رخ وہ ہے جو صرف بنگال تک محدود رہا اور جس کی روح رواں حاجی شریعت اللہ اور اس کے لڑکے دادو میاں تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے ۱۸۱۸ء میں اپنی تحریک شروع کی جس کا مطمع نظر مسلمان عوام کو انگریزوں اور ہندو زمینداروں کے مظالم کے خلاف متحد کرنا تھا۔ اس نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا لیکن چند بنیادی معاشرتی اصلاحات کے علاوہ اس نے عملی طور پر کوئی قدم انگریزوں کے خلاف نہ اٹھایا لیکن محمد محسن (۱۸۱۹–۱۸۶۲) نے جس کو عام طور پر دادو میاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک میں بہت زیادہ قوت پیدا کی۔ اس نے مشرقی بنگال کے تمام مسلمان عوام کو ایک تنظیمی وحدت میں منسلک کر دیا اور اس طرح بہت حد تک ان کو انگریز اور ہندو سرمایہ داروں کی مشترکہ لوٹ کھسوٹ سے بچانے کی کامیاب کوشش کی۔

سرسید کی نئی پالیسی کے جواز میں بعض لوگوں نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ سید احمد بریلوی کی تحریک ذہنی تحریک تھی۔

؛ اس کا مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا بلکہ صرف سکھوں کے مظالم کے خلاف ایک کوشش تھی۔ لیکن یہ دونوں باتیں واقعات کے خلاف ہیں۔ یہاں ہم تحریک جہاد کی تفصیلات بیان کرنے سے معذور ہیں لیکن مستند معلومات کی بنا پر یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحریک یقیناً عوام میں مقبول تھی اور عوام ہی کے مکمل تعاون سے تقریباً نصف صدی تک شمالی ہندوستان میں چلتی رہی۔ اس میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے جنہوں نے اس مقصد عظیم کے لئے ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ اس تحریک کے متعلق ہر مستند کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کی ہمہ گیری کسی خاص طبقہ تک محدود نہ تھی بلکہ علماء سے لے کر عوام تک سبھی اس میں شامل تھے اور کچھ کم پچاس برس تک خصوصاً شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی تمام قابلیتیں اسی مہم کی کامیابی میں صرف کر دیں۔ دوسری طرف یہ کہنا کہ اس تحریک کا تمام تر مقصد صرف سکھوں کے خلاف تھا حالات کی غلط تعبیر اور اس کی صحیح حقیقت سے انکار کے مترادف ہوگا[1]۔ چنانچہ ایک خط میں سید احمد بریلوی خود لکھتے ہیں کہ:

"ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور انہوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی، کسی کو اس کے مقابلے کی تاب نہیں بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ چونکہ بڑے بڑے اہل حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے چند کمزور اور بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑا اٹھایا"

جنگ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء میں اس تحریک کا پہلا دور ختم ہوا لیکن اس کے بعد کئی سال تک سرحد میں انگریزوں کے ساتھ مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں جس کے لئے سارے شمالی ہندوستان کے مسلمان برابر روپیہ اور آدمی بھیجتے رہے۔

سرسید اس تحریک کے ابتدائی دور سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ کافی حد تک اس سے متفق بھی معلوم ہوتے ہیں جب آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا یعنی تقریباً ۱۸۴۷ء میں، تو انہوں نے جن الفاظ میں اس تحریک کے بانیوں کا ذکر کیا ہے وہ ان کے دل کی حالت کا صحیح آئینہ ہے۔ ۱۸۵۷ء تک ان کے دل میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو اس دور کے عام مسلمانوں میں تھا یعنی انہیں کچھ امید تھی کہ اس طریقہ جہاد سے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی حالت پھر سنبھل سکتی ہے۔ لیکن جب یہ تحریک اپنے اولین مقصد میں ناکام رہی اور اس کے بعد انگریزوں نے اس تحریک کے مختلف عناصر کو دبانے کی کوشش شروع کی تو اس وقت شاید سرسید کے دل میں پہلی بار احساس ہوا کہ یہ طریقہ اب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے صرف ۳ سال پہلے انہوں نے آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور اس دفعہ اس میں سے وہ تمام باب جس میں اس تحریک اصلاح و جہاد کے بانیوں کا پُر عقیدت ذکر موجود تھا بالکل نکال ڈالا۔ یہ ترمیم اس چیز کی غماز ہے کہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر سرسید اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ یہ راستہ اس قوم کی اصلاح کے لئے درست نہیں۔ قوم نے اپنی سیاسی اور معاشی حالت سنوارنے کے لئے اپنی تمام قابلیتیں، اپنا تمام مال

---

[1] اس غلط نقطہ نگاہ کو پیش کرنے کی ابتدا بھی شاید سرسید نے ہی ایک   مقصد کے لئے کی تھی۔ جب انہوں نے ڈاکٹر   کی کتاب کا جواب لکھا تھا۔

اور انہوں نے اپنی تمام کوششیں اسی ایک تحریک کے لئے وقف کر دی تھیں لیکن اس کی ناکامی نے ان کو بہت سے پہلو بدلنے پر مجبور کیا۔ حالات بڑے نازک تھے۔ انھیں پتہ تھا وہ تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہے تھے۔ ماضی جو کچھ تھا تھا لیکن حال اور مستقبل کی تاریکی ان کے سامنے منہ کھولے کھڑی تھی اور کوئی امید یا راستہ ان کو اس مصیبت سے نجات دلانے کا نظر نہ آتا تھا۔ سرسید نے محسوس کر لیا کہ اب میدان جنگ میں انگریزوں سے نپٹنا ممکن نہیں اسلئے کوئی اور بہتر راستہ تلاش کرنا ضروری ہے۔ چند ہی سالوں میں بغاوت شروع ہوئی اور مسلمانوں نے حسب معمول اپنی تمام تر کوششیں اس میں صرف کر دیں لیکن نتیجہ نہ صرف افسوسناک بلکہ قوم کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا۔ مسلمانوں میں قابلیت اور صلاحیت کی کمی نہ تھی اور اس چیز سے سرسید ناواقف نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے بیان کیا، کہ اگر بغاوت نہ ہوتی تو بے شمار مسلمان فوج اور دوسرے سرکاری محکموں میں بڑی اچھی جگہ پر نظر آتے۔ لیکن اس ایک حادثہ نے ان کی قسمت کا فیصلہ ان کے خلاف کر دیا۔ حکومت نے مسلمانوں کو کچلنے کے لئے اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی اور چند ہی دنوں میں یہ واضح ہو گیا کہ اس قوم کا ماما شاید عمر بھر بھی نہ ہو سکے۔ اسی تاریک دور میں سرسید کے دل میں ہندوستان سے ہجرت کرنے کا بھی خیال آیا چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ

"میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔"

ایک دوسری جگہ ان حادثات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اسی اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی برس اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائیس، خانساماں، خدمتگاری، گھاس کھودنے ہونے کے سوا اور کسی درجہ میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو مسلمان کے نام سے نہ پکارا جائے گا۔"

اس انتہائی تاریکی و مایوسی کے دور میں سرسید نے مسلمانوں کے لئے جس نئی پالیسی کا فیصلہ کیا اس کو سمجھنے کے لئے اس تحریک کی ناکامی کے اسباب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔ چونکہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں سرسید کافی دیر تک اسی تحریک کے حامی رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاید اس طریقے سے مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکیں۔ سب سے پہلی چیز جو انہیں محسوس ہوئی وہ ایک طرف انگریزوں کی علمی اور عملی برتری کا احساس تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کی ان دونوں معاملوں میں کم مائیگی۔ مسلمانوں کے پاس جو کچھ علم تھا سب قدیم اور بیکار اور زندگی کے مسائل سے بالکل بے ربط۔ چنانچہ ایک لیکچر میں قدیم اور جدید علم کا فرق بتلاتے ہوئے انہوں نے کہا:-

"ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقل کو عقلی دلائل سے توڑتے پھوڑتے رہے۔ مگر اس زمانہ میں نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانے کے فلسفہ و حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربہ سے ثابت کئے جاتے ہیں۔"

مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جائیں۔

انگریز اس علم کی بنا پر جدید طرز کے آلات سے آراستہ تھے، ان کے اس علم کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز انقلاب آیا تھا اور یہاں صرف وہی ارسطو اور بطلیموس کا فلسفہ اور ہیئت یا چند پرانے اقتصادی یا معاشرتی تصورات جو کسی حالت میں بھی زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ایسی حالت میں جب مقابلہ بالکل صفر اور ہزار کا ہو تو نتیجہ عیاں ہے محض جذبۂ مذہبی، اخلاقی برتری یا اوپری تنظیم سے یہ نمایاں فرق اور کمی تو پوری ہونے سے رہی۔ اسی احساس نے سرسید کو مجبور کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح قوم کو یہ احساس دلائیں کہ جہاد مذہبی فریضہ ہے تو صرف اس وقت جب میدان جنگ میں اترنے کے لئے اس کے کچھ پاس بھی ہو، صرف جذبۂ جہاد سے تو قومیں فتحیاب نہیں ہو سکتیں۔ انگریز غاصب ہے۔ کافر ہے، گردن زدنی ہے صحیح، مگر اس کو ملک سے باہر نکال دینے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے کیا وہ تمہارے پاس ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ جہاد کس بل بوتے پر؟ ایسی حالت میں جہاد تو گویا خودکشی کے مرادف ہوگا۔ چنانچہ اسی لئے سرسید نے قوم کی توجہ جہاد سے ہٹا کر تعمیری کاموں کی طرف لگا دینی چاہی۔ جب اس نے کہا کہ تم انگریز کے وفادار ہو جاؤ اور اس سے تعاون کرو تو حالات کا تقاضا بھی تھا۔ بعض دفعہ میدان جہاد سے ہٹ آنا بھی بزدلی نہیں بلکہ جوانمردی ہے تاکہ آئندہ زیادہ تیاری سے جہاد میں حصہ لیا جا سکے۔ اس سلبی اور وقتی پروگرام کے ساتھ ساتھ اس نے قوم کے سامنے ایک تعمیری اور مستقل پروگرام بھی پیش کیا اور وہ تھا مغرب کے تمام علمی کارناموں کا اپنانا۔ اسی علمی کم مائگی سے ہی تو مسلمان ہندوستان کے ہر گوشے میں دشمنوں سے مات کھا چکے تھے۔ لیکن چونکہ یہ پروگرام اپنی کامیابی کے لئے وقت چاہتا تھا اور وقتی طور پر مسلمانوں کے جذبات کی تسکین نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے بہت کم لوگ اس کی افادیت کو سمجھ سکے سامر تھے ان کی طرف سے اس نئی پالیسی کی مخالفت ایک فطرتی امر تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی ذہنی اور عملی حالت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ جہاد اصغر کو چھوڑ کر جہاد اکبر کی طرف رجوع ہوں تاکہ ذہنی علمی اور عملی سب حیثیتوں سے مسلح ہو کر وہ اس مقصد کے لئے تیار ہو سکیں۔

سرسید کی نگاہ میں مسلمانوں کی بین الاقوامی سیاست میں دلچسپیاں بھی کم خطرناک نہ تھیں۔ سلطان عبدالحمید نے ذاتی استحکام کی خاطر پین اسلامزم کا ایک خالی نعرہ ایجاد کیا۔ جہاں تک حکومت ترکیہ کا تعلق تھا یہ نعرہ کسی حد تک تو کامیاب رہا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس میں نقصان کا کافی اندیشہ تھا۔ انگریزوں کی پالیسی عام طور پر ترکوں کے خلاف تھی اس لئے مسلمانوں کا کسی غلط مسلک کے باعث محض جذباتی طور پر ان سے ہمدردی کا اظہار ان کی ملکی حیثیت پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ان بے معنی نعروں میں الجھ کر اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈالیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے مختلف مضامین میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خلافت کا ایسا تصور جس کے مطابق ترکیہ کا کوئی بادشاہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا مذہبی رہنما ہو سکتا ہے اور جس کا حکم ماننے پر وہ مذہبی طور پر مجبور ہوں بالکل غلط ہے۔ اطالوی استعمار کے برے پہلوؤں سے وہ پوری طرح خبردار تھے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ ان کو ان معاملوں میں الجھانا ان کے نزدیک کسی حالت میں بھی فائدہ مند نہ تھا۔ ابھی اگر

بد قسمتی سے وہ ایسا کر بیٹھتے تو دنیائے اسلام کا فائدہ ہوتا یا نہ ہوتا کم از کم ان کے لئے خودکشی سے کم نہیں تھا۔ سرسید کی نگاہ میں صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا مفاد تھا اور اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان سب بظاہر دلکش لیکن حقیقتی طور پر بے معنی نعروں کی نیچے رہیں۔ جمال الدین افغانی نے جو اعتراضات سرسید کے متعلق کئے وہ ہر لحاظ سے غلط اور بے محل تھے۔ سرسید کے خیالات اور تعلیمی کام کا جائزہ افغانی کے اعتراضات کی روشنی میں کرنا ایک ایسا غلط قدم تھا جس کی بنا پر بے شمار غلط فہمیاں لوگوں میں آج تک موجود ہیں۔

اس دور میں (۱۸۶۹ - ۱۸۷۰) جب سرسید مسلمانوں کے سامنے اپنا ایک سیاسی پروگرام رکھ رہے تھے۔ ہندوؤں میں بالکل مختلف قسم کی تحریکیں جاری تھیں۔ وہ راجہ رام موہن رائے اور رابندر ناتھ ٹیگور کی محض مدافعانہ کوششوں سے کہیں آگے جا کر دویکانند اور دیانند کی جارحانہ ہندو قومیت کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے اب ہندو قوم کو عیسائی مشنریوں کے حملہ سے بچانا نہیں تھا بلکہ غیر ہندوؤں میں ہندو تہذیب اور مذہب کا پرچار کر کے ان کو ہندو بنانا۔ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر سیاسی قوت حاصل کرنا تھا۔ یہ جارحانہ عزائم اب نہ انگریز سے پوشیدہ تھے اور نہ سرسید سے۔ بنگال کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف ایک منظم پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کو ہندوستان میں ایسا ذلیل کر دیا جائے کہ وہ کسی طرح سر نہ اٹھا سکیں۔ ایسے حالات میں سرسید کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا حکومت سے سو فیصدی تعاون اور وفاداری کا اظہار تاکہ وہ دو دشمنوں کے پاٹ میں آکر پس نہ جائیں۔ اگر وہ ایسا قدم نہ اٹھاتے تو اس ملک میں مسلمانوں کا وجود یقیناً خطرہ میں پڑ جاتا۔ اصلاح حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ہر محاذ پر صلح اور امن رہے۔ مخالفت اور جنگ کی حالت میں قوم کی تعمیری اصلاح ناممکن تھی اس لئے سرسید نے یہی مناسب سمجھا کہ انگریز سے وفاداری اور تعاون کیا جائے اور ہندوؤں سے کسی قسم کا سیاسی جھگڑا نہ چھیڑا جائے تاکہ قوم کی تمام تر توجہ اپنی اصلاح میں لگ سکیں۔ ان کا مسلمانوں کو ہر قسم سیاسی شورش سے علیحدہ رہنے کا مشورہ ان حالات میں بہترین لائحہ عمل تھا۔

سرسید کی تحریک کا دوسرا امتیازی پہلو اس کا نیا مذہبی فکر ہے۔ کیا اسلام دنیاوی ترقی میں مانع ہے؟ انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی نے یورپ کی قوموں کو چند سالوں میں دنیا کی بہترین سیاسی قوت عطا کی اور اسی دور میں ترک قوم آہستہ آہستہ قعر مذلت میں گرتی گئی۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب ترکوں نے زمانے کی روش کے ساتھ چلنا چاہا تو وہاں کے مذہبی اجارہ داروں نے اس کو ترقی کے راستے پر گامزن ہونے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ اقدامات اسلام کے خلاف ہیں۔ کیا ان حالات میں دشمنوں کا یہ کہنا کہ اسلام دنیاوی ترقی میں مانع ہے غلط قرار دیا جا سکتا تھا؟ واقعات یہی کچھ بتلا رہے تھے۔ ہندوستان میں بھی اسلام کی بنیاد پر ایک تحریک اصلاح اٹھی تھی جس کے علمبرداروں نے اپنے بلند اخلاق اور صالح کردار کے باعث خلافت راشدہ کا دور زندہ کر دیا۔ لیکن وہ ناکام رہی۔ کیا اسلام زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے؟ کیا ہندوستان کے مسلمان کا مستقبل مذہب کی وابستگی کے ساتھ درخشاں ہو سکتا ہے؟ سرسید کے لئے یہ سوال بہت اہم تھا اور اسی سوال کے صحیح جواب پر اس کی تمام کوششوں